راہ نجات

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر مغربی طاقتوں (برطانیہ اور فرانس) نے مشرق وسطی میں عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا' فلسطین میں یہودیوں کی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ بنایا' جو ۱۹۴۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ جب برطانیہ اقوام متحدہ کے توسط سے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے وہاں سے رخصت ہوگیا اور یوں دو عالمی جنگوں میں اپنے عرب ساتھیوں کو یہ بتا دیا کہ: "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"

۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک برطانیہ' فرانس اور امریکہ نے عربوں کے خلاف اسرائیل کی جارحیت کو برابر تحفظ دیا (البتہ ایزنہاور انتظامیہ کسی حد تک اس سے مستثنیٰ ہے) اور عرب دنیا میں اٹھنے والی ہر قومی تحریک کو مختلف بہانوں سے دبایا۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر اسرائیل اور اینگلو فرنچ فوجوں کا حملہ' پھر ۱۹۶۷ء میں جونسن انتظامیہ کے اشارے پر مصر پر اسرائیل کا حملہ' غرضیکہ اس صدی میں اب تک صحرائے سینا اور فلسطین کی مقدس سرزمین پر جس قدر عرب خون بہایا گیا ہے' اس کی ذمہ داری جہاں عربوں کی سادگی' نادانی اور جرم ضعیفی پر عائد ہوتی ہے' اس سے کہیں زیادہ برطانیہ اور فرانس پر عائد ہوتی ہے' جن کا سیاسی ضمیر اخلاق نامی چیز سے قطعاً" ناآشنا ہے۔

ایک وقت تھا کہ مغرب کی مکروہ سازشوں سے بچنے کے لیے عربوں نے سویت یونین کا سہارا لیا' اور کسی حد تک مغرب کی ظالمانہ کارروائیوں سے محفوظ بھی رہے۔ ان کی یہ رائے یقیناً درست تھی کہ عالمی سٹیج پر دو متحارب طاقتوں کی باہمی کشمکش سے چھوٹی اور کمزور قوموں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے فائدہ اٹھایا' لیکن جب ۱۹۹۰ء میں سویت یونین کا سقوط ہوا' تو تیسری اور عرب دنیا کو پتہ چلا کہ مغرب کے جارحانہ عزائم کی راہ میں حائل "دیوار چین" ٹوٹ چکی ہے اور اب آسمان سے جو بھی بلا اترے گی' وہ "عربوں" ہی کے گھر کا پتہ پوچھے گی۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ پہلے ایک سازش کے ذریعہ کویت پر عراق کے ممکنہ حملے پر معنی خیز خاموشی اختیار کی گئی اور عراق کو اس کی تمناؤں میں مزید الجھایا گیا۔ پھر اسی عراق کو کچلنے کے لیے مغربی طاقتوں نے جس بے رحمی سے عراق پر آگ کی بارش برسائی اور عوام کو بھوکا مارنے کے لیے ساری دنیا سے اقتصادی بائیکاٹ کرایا' اس سے پوری مسلم دنیا سہم سہم گئی' اور اس نے آج تک مغرب کے اس ظالمانہ قدم کے خلاف ایک آواز بلند نہ کی۔

آج مشرق وسطی میں اسرائیل ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا ہے اور اس نے مغربی طاقتوں کی "دعاؤں" (Blessings) سے عرب دنیا کے سامنے اپنا امن منصوبہ پیش کیا ہے' جسے عرب ملک یکے بعد دیگرے قبول کرتے جا رہے ہیں۔ انہیں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ اب ان کے سامنے اسرائیل کی طاقت کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی تیسری راہ نہیں ہے' کیوں کہ اسرائیل نے پنی "سیاسی بصیرت" سے کام لیتے ہوئے ان روحانی طاقتوں سے اپنا لوہا منوا لیا ہے' جو ادھر دو ہزار سال سے یہودیوں کو اپنا دشمن تصور کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف اسرائیل نے پاپائے روم کو اپنے شیشے میں

اتار لیا ہے' دوسری طرف اپنی سائنسی برتری سے بھارت' چین اور روس جیسے ملکوں سے سیاسی رشتے استوار کر لیے ہیں' جو روایتی طور پر عربوں کے دوست تصور کیے جاتے تھے۔

اسرائیل کی اس کامیابی کا ایک بڑا سبب اس کی فوجی' سیاسی اور علمی طاقت ہے' جسے دنیا تسلیم کرتی جا رہی ہے۔ مغربی طاقتوں کی جلو میں مشرق وسطی میں اسرائیل کا ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے سامنے آنا' ایک ایسا سنگین مسئلہ ہے جس پر عرب دنیا کے اہل دانش برابر سوچ بچار کر رہے ہیں' اس سلسلے میں حال ہی میں دمشق کے ایک معروف ماہوار ثقافتی مجلّے "المعرفہ" (جولائی ۱۹۹۴ء) نے اسماعیل شعبان کا ایک مقالہ شائع کیا ہے' جس کا عنوان ہے : " عرب سرزمین میں سیاست اور اس کے اقتصادی اور اجتماعی نتائج" ۔ فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ سویت یونین اور سوشلسٹ حکومتوں کے سقوط سے یہ ملک بڑی طاقت کے مقام سے نیچے اتر کر تیسری دنیا کے ملکوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ وقت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ سابق سویت یونین نہ صرف دنیا میں آزادی پسند تحریکوں کی حمایت سے دست بردار ہو گیا ہے' بلکہ سلامتی کونسل میں سامراجی طاقتوں کا حلیف بن کر تیسری دنیا کے بعض ملکوں کے خلاف بھی ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اقوام متحدہ امریکہ کی مٹھی میں ہے' جو جدید دنیا کی موجودہ صورت حال' صیہونیت کی نمائندہ اسرائیل اور مغربی یورپ کی طاقتوں کا اکیلا سربراہ بن گیا ہے اور یہ سب طاقتیں عربوں کو جنھوں نے ان طاقتوں کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے ہیں' قطعاً" پسند نہیں کرتیں۔ مزید یہ کہ خلیج کی جنگوں نے اقتصادی' فوجی' نفسیاتی اور نظریاتی طور پر عرب اور مسلم امت کی کمر توڑ دی ہے۔ اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عرب قوم کا فرض ہے کہ وہ فوجی' سیاسی' اقتصادی اور علمی میدانوں میں صرف

اپنے وسائل پر اعتماد کرے۔

مقالہ نگار تفصیل سے عرب دنیا کی موجودہ اجتماعی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں کہ ماضی اور حال میں عرب دنیا کے المیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ دوسری قوموں کی بہ نسبت عرب قوم انانیت کا شکار ہے' وہ نحن (ہم) یعنی قومی مفاد پر "انا" (میں) ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔

ا۔ وہ علمی' ٹیکنالوجی' فوجی' زرعی اور صنعتی میدان میں پیچھے ہے۔

۲۔ عرب دنیا کے اکثر حصوں میں لوگوں کو معروضی تنقید کی آزادی حاصل نہیں ہے' یہاں آزادی اور جمہوریت کی رو سے انسان کے بنیادی حقوق بھی کا پتہ نہیں چلتا۔ اجتماعی انصاف اور اصلاح کو کوئی تحریک پائی نہیں جاتی' یہ اور اس قسم کی دوسری غلطیوں نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کے المیوں کو جنم دیا اور ستم یہ ہے کہ ان قومی ٹھوکروں کو "بکے ہوئے قلم" خوبی قرار دے رہے ہیں۔

عرب دنیا کے موجودہ اجتماعی بگاڑ کا ذکر کرنے کے بعد شعبان صاحب لکھتے ہیں کہ ہمیں اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے جاپان کے مثالی تجربہ سے سبق لینا چاہیے' دوسری جنگ عالم گیر کے بعد ایک جاپانی کی سالانہ آمدنی صرف بیس ڈالر تھی' لیکن گزشتہ ۴۵ سالوں میں یہ آمدنی بیس ڈالر سے بڑھ کر چوبیس ہزار پانچ سو ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ جاپانی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے شعبان صاحب لکھتے ہیں:۔

ا۔ مشکل وقت میں وطن کے لیے کام کرنا' جنگ اور امن کے وقت میں وطن کے لیے قربانی کا جذبہ

۲۔ ممکن حد تک عقل و دانش سے کام لینا

۳۔ جماعتی روح کی سیادت کو ماننا

۴۔ حقوق کی بجائے ادائے فرائض پر زیادہ زور دینا

۵۔ وقت کی قدر کرنا اور کام کو مقدس جاننا
۶۔ عمدہ اور متحرک نظام تعلیم
۷۔ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کے اچھے عناصر کو جذب کرنے کی حیرت ناک قدرت
۸۔ علم، ٹیکنالوجی اور تحقیق و ریسرچ پر کامل اعتقاد
۹۔ اپنی شخصیت کو مہذب بنانے کے لیے مطالعہ کا شوق اور علمی پیاس کو بجھانے کے لیے ہر گھاٹ پر جانا
۱۰۔ بدلتے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو سازگار بنانے کی صلاحیت

آخر میں فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ اگر تیسری دنیا کی قومیں، خاص کر عرب قوم جاپانی قوم کی خوبیوں سے آراستہ ہو جائیں تو معجزات کی تخلیق کر سکتی ہیں۔

آج اسماعیل شعبان اور ان کے بھائیوں نے وقت کے ہاتھوں شکست و ذلت کے پے بہ پے جام پینے کے بعد اپنی قوم سے جو دردمندانہ اور حقیقت پسندانہ اپیل کی ہے، یہی بات علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے برصغیر کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی ملی ثقافت و تہذیب بچانے کے لیے یہودیوں، پارسیوں اور جاپان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

آج پاکستان سیاسی اور اقتصادی طور پر جس بحران سے دوچار ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج ہم اپنے نظام تعلیم و تربیت سے یک قلم بے خبر ہوگئے ہیں۔ ہمارے علمی اور اخلاقی انحطاط نے ہماری اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو بری طرح سے متاثر کیا ہے اور ہماری قوم کی اکثریت، جو دیہاتوں میں بستی ہے، غربت و افلاس اور لاقانونیت کی تاریک راہوں میں بھٹک رہی ہے اور بہ زبان حال خدا سے کہہ رہی ہے :۔ کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ

ارزانی۔ ہماری ارباب دانش اور اصحاب درد سے التماس ہے کہ وہ ہمارے قومی انحطاط کو منطقی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے اپنے نظام تعلیم و تربیت کو اپنی علمی روایات اور روح عصر سے ہم آہنگ کریں اور اسے ان لوگوں کی قید سے نجات دلائیں جو اس میدان کے آدمی نہیں ہیں۔ یہی ایک راہ ہے' جس پر چل کر ہم ایک نئے المیہ سے بچ سکتے ہیں۔

(رشید احمد)